

وقت کا اہم ترین سوال

فقہی قوانین کی دینی حیثیت

فقہی قوانین کی دینی حیثیت

انسان فطرتاً ہی الطبع واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے بل جل کر رہنا ضروری ہے۔ انفرادی زندگی میں (یعنی جہاں ایک فرد تنہا زندگی بسر کرے) کوئی تصفیہ طلب معاملہ پیدا نہیں ہوتا لیکن اجتماعی زندگی میں اس قسم کے معاملات کا نمودار ہونا ناگزیر ہے۔ جب دو انسانوں میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے لئے کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے متنازع فیہ معاملہ میں تصفیہ کرے۔ جو صورت دو افراد میں پیدا ہو سکتی ہے وہ عام معاشرہ میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے انسانوں نے اپنے لئے ایک نظام وضع کیا جسے نظام حکومت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تو قبائلی یا پانچائیت کی سی تھی لیکن اس کے بعد جب اس نے وسعت اختیار کر لی تو کسی ثالث کی ضرورت پیش آئی۔ اس ثالث کو حاکم کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی فیصلہ کرنے والا۔ اسے شخصی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ایک فرد کا حکم قول فیصل قرار پا جاتا تھا اور اس کی نافرمانی مستوجب سزا ہوتی تھی۔ بالفاظ دیگر اس میں جملہ افراد معاشرہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کے حکوم ہوتے تھے۔ انسانی تمدنی زندگی آگے بڑھی تو احکام کی جگہ قانون کا تصور پیدا ہوا۔ احکام اور قانون میں فرق یہ تھا کہ حکم تو وقتی ہوتا تھا لیکن قانون سے مراد یہ تھی کہ جب تک اسے بدلنا جائے وہ کارفرما ہے۔ اُس وقت سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قسم کے قوانین کون وضع کرے۔ قانون کی حکمرانی کے زیادہ میں یہ جو ہم نظام حکومت کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں قریب درحقیقت انسان کی اسی کوشش کے مختلف مظاہروں کا نام ہے جس کی رو سے وہ طے کرنا تھا کہ قانون سازی کے اختیار کے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی آخری شکل نظام جمہوریت ہے۔ لیکن عہد کین کی شخصی حکومت ہو یا عصر حاضر کی جمہوریت، اس میں انسان بہر حال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی ان تمام کوششوں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایک دین عطا فرمایا جس کی بنیاد احترام انسانیت اور شرفِ آدمیت پر تھی۔ اس نے کہا کہ ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکویم ہے۔ اس لئے یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ، وہ کسی کا حکم ہو یا انسانوں کا وضع کردہ قانون۔ بات ایک ہی ہے۔ اس میں انسان دوسرے انسانوں کا محکوم ہوتا ہے اور یہ چیز احترامِ آدمیت کے منافی ہے۔ اس لئے یہ انقلاب آفرین اعلان کیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ

كُونُوا عِبَادًا لِّیْهِمْ دُوْنَ اللّٰهِ (پیش)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اسے مضابطہ قوانین، اختیار حکمرانی، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے حکوم بن جاؤ۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے، کسی انسان کو نہیں، خواہ وہ شخصی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ قانون سازی کے اداروں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نبی تک کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ بشرط انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بالاکسی ہستی کو ہو۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں انہیں مومن۔ یعنی خدا پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں صرف خدا کو حاصل ہے۔

اس ایمان باللہ کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ نہیں کہیں دکھائی دیتا ہے نہ وہ ہمارے سامنے

آتا ہے، نہ ہم اپنے کانوں سے اس کی بات سن سکتے ہیں تو اس کے احکام کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کا جواب خدا نے اسی آیت میں دے دیا جس کا آدھا

کتاب اللہ کی حاکمیت

حصہ ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ اس کا باقی حصہ یوں ہے :

وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّاتِنَ مِمَّا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتٰبَ وَیَمَّا كُنْتُمْ قٰذِرِیْنَ (پیش)

نہیں کسی انسان کی حکومیت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ بحکومیت صرف خدا کی اختیار کرنی چاہیے اور اس کا تدبیر وہ کتاب ہے جسے اس نے نازل کیا ہے۔ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے

دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہو۔

آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے کیسے بلیغ انداز سے اس بات کو سمجھا دیا کہ خدا کی حکومیت اختیار کرنے کا قابل عمل طریقہ کیا ہے۔ آپ غور کیجیے کہ آج اس دور میں جسے انتہائی تہذیب و تمدن کا زمانہ کہا جاتا ہے، مبنی بر عدل حکومت کا تصور یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک آئین مرتب کرتی ہے۔ اس آئین کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ پھر اس آئین کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی کتابوں کی شکل میں عام کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر مشنازہ فیہ معاملہ کے تصفیہ کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر حکمرانی کتاب کی ہوتی ہے۔ کتاب کی حکمرانی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔ ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے جب تک وہ ہمیں خود حکم نہ دیں۔ کوئی اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ خود کیجئے کہ قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی کہ حکمرانی کتاب رضا بطور قوانین کی جوتی ہے اور اس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ صاحب کتاب خود ہمارے سامنے آکر حکم دیے تو پھر ہی اس کی اطاعت کی جائے۔ کتاب کی اطاعت درحقیقت کتاب دینے والے کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہذا اللہ کی اطاعت کی عملی شکل اس کی کتاب کی اطاعت ہے، اور اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم اس کی کتاب پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان نہیں لانا، اس کا خدا پر ایمان لانا بھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی کتاب کی حکومیت اختیار نہیں کرتا وہ خدا کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :

وَمَنْ لَّمْ يَتَّخِذْ مِمَّا آتَاكَ اللَّهُ قَالًا وَلْيَصِلْ هَٰذَا الْكَافِرُونَ۔ (۱۱)

جو لوگ خدا کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتے وہ تو من نہیں کا فر کہلاتے ہیں۔
 ۱۲) جس کتاب کی محکومیت اختیار کی جانی مقصود ہو یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو واضح طور پر بیان کرے،
 اس میں کوئی ابہام نہ ہو کسی قسم کا القباس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی اس خصوصیت کو مختلف مقامات پر واضح
 کر دیا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے :-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۖ (۱۳)

اسے رسول! ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان
 کر دیتی ہے۔

۱۴) خدا کی اس محکومیت کا سلسلہ تو شروع سے جاری تھا لیکن چونکہ ان (ابن دانی) ادوار میں نہ انسانی ذہنوں میں ہنوز سمجھنے
 کی تھی نہ ان کے علم اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوئی تھی، اس لئے انہیں زیادہ ترقی اور عارضی احکام دیتے جاتے تھے۔ یہ
 وجہ تھی کہ ان کی طرف جلدی جلدی رسول بھیجے جاتے تھے اور ان رسولوں کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا تھا۔ جب مشیت
 کے پروگرام کے ماتحت انسانیت سمجھنے کے دور میں پہنچ گئی (یوں کہتے ہیں کہ جب کچھ جو ان ہو گیا، تو خدا کی طرف سے ایک
 ایسا ضابطہ آئین و قوانین نازل کر دیا گیا جو عالمگیر انسانیت کے لئے کبھی کافی ہو اور آنے والے تمام زمانوں کے تقاضوں کو
 بھی محیط ہو۔ وہ ہر طرح سے مکمل ہو اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ پڑے جتنا اللہ تعالیٰ
 نے اس کتاب کو نازل کر دینے کے بعد فرمایا کہ :-

وَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ النَّاسِ إِذْ أَنزَلَ فِيهِ الْفُصُولَ ۚ لَا مَبْدَلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ (۱۵)

خیر ہے رب نے جو کچھ انسانوں کے کہنا تھا اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس میں مندرج قوانین میں
 کسی قسم کے تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ ضابطہ قوانین اس خدا کی طرف سے نازل کردہ
 ہے جو سب کچھ سمجھتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی اس ضابطہ قوانین میں نہ کسی اصول کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس کے بعد ایک ہی سوال
 باقی رہ جاتا تھا کہ اگر کسی وقت یہ کتاب حوادث ارضی و سماوی سے ناپید ہو گئی، یا اس میں کسی نے تحریف کر دی، تو پھر کیا
 صورت ہوگی۔ فرمایا کہ اس کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ :-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (۱۶)

ہم نے ہی اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ اس میں نہ تحریف ہو سکے گی
 اور نہ ہی یہ ضائع ہوگی۔

یعنی قرآن مجید خدا کا مکمل ضابطہ قوانین ہے جس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آسکے گی اور یہ غیر عرف بھی
 رہے گا اور محفوظ بھی رہے گا۔ اس قسم کی کتاب کے بعد خدا کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔
 ختم نبوت اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ تھا :-

(۱۷) ہم نے دیکھا ہے کہ دین، مذہب کی طرح خدا اور بندے کے درمیان کسی پراسٹیوٹ مقید سے کا نام نہیں جو انسانوں

کے خود ساختہ تصور کی رو سے پوجا پاٹ، بھگتی یا پرستش کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ دین انسانوں کی اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے۔ جس میں خدا کی کتاب کی حکومت اختیار کی جائے۔ جب ہم نظام زندگی یا حاکمیت اور حکومت کے الفاظ بولتے ہیں تو اس سے لازماً ایک نظام حکومت یا مملکت کا تصور سامنے آتا ہے۔ مملکت کے بغیر کسی کتاب کی حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے یہ کہہ خود واضح کر دیا کہ دین کا ممکن اسی صورت میں ممکن ہے جب دین کے ماننے والوں کو ملک میں حاصل ہو۔ سورۃ النور میں ہے۔

مملکت کی ضرورت

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (پاکستان)
جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور صلاحیت بخش کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین پر اقتدار عطا کرے گا جس طرح اقوامِ سابقہ کی صورت میں کیا گیا تھا تا کہ اس طرح وہ دین ممکن ہو سکے جسے اس نے ان کے لئے منتخب کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ جماعتِ مومنین کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا ممکن ممکن ہی نہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ دین کے ممکن کے معنی ہیں کتاب اللہ کی حکومت قائم ہونا اور حکومت لاء اعمال اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے! — آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ آئین پاکستان اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب مملکت پاکستان موجود ہو۔
ہمنا مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس مملکت میں دین کا ممکن مقصود ہو، وہ ظلم اور استبداد، دھاندلی اور سلب و نہب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ وہ خدا کی حاکمیت پر ایمان اور اس کے مطابق صلاحیت بخش پر ہوگا۔ مگر اس کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ بہر حال ہم کہہ رہے ہیں کہ دین کا ممکن — یعنی کتاب اللہ کی حکومت — اپنی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے۔ سورہ النج میں ہے۔

الَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا فِي الْأَرْضِ مُدَّ أَقْسَامُ الصَّلَاةِ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ أُولَٰئِكَ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۴)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور اتانے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے جن امور کو کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہے انہیں ممکن نافذ کریں گے۔ جنہیں اس نے ناجائز ٹھہرایا ہے ان پر پابندی عائد کریں گے۔ مختصراً یہ کہ ان کا ہر معاملہ انجام کار خدا کے قوانین کے مطابق طے پائے گا۔

اس مقام پر ایک بڑا اہم اور غور طلب نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے قرآن مجید کی سورتوں کو مکی اور مدنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ان کے معیار تقسیم کے متعلق تو سر دست کوئی بات نہیں کرنا چاہتے لیکن اس اہم حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ مکی آیات کی سورتوں میں کہیں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ (اے جماعتِ مومنین) نہیں آیا۔ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ (اے لوگو!) ہی آیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ مدنی آیات ہی میں آیا ہے۔ مکی زندگی میں اکثر حضرات اسلام لے آئے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی ہنوز انفرادی تھی اس لئے انہیں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب انہیں اقتدار حاصل ہو گیا اور انہوں نے اپنی مملکت قائم کرنی تو اس وقت ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے مخاطب

کے اہل قرار پائے۔ اس سے واضح ہے کہ اباب ایمان یا ایہا الذین آمنوا کہہ کر پکارے جانے کے مترادف اس وقت ہوتے ہیں جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ کتاب اللہ کی حکومت قائم کر سکیں۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ دہر کہا جا چکا ہے، خدا پر ایمان کا عملی مفہوم کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں حتمی امتیاز ہے۔ جیسا کہ اس لئے کہا ہے۔ وَمَنْ كَفَرَ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اس قسم کی مملکت نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں مدینے میں قائم ہوئی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ :-

فَأَحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ . (۳۴)

اے رسول! تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اور وحی خداوندی نے حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کر دیا کہ :-

أَفْخِرُوا بِاللَّهِ أَبْغَىٰ حَكْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا . (۳۵)

اے لوگو! (جو انسانوں کی حکومت کے شوگر ہو چکے ہو) کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی خدا کو چھوڑ کر انسانی حاکم تسلط کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کر

دیتی ہے۔

آپ نے حضورؐ فرمایا کہ وہ جو (آیت ۳۴ میں) کہا گیا تھا کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے، نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے اس طرح واضح الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا۔ بلکہ یہاں تک کہ دیکھا

قُلْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۳۶)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانی کر دوں تو میں بھی اس کے عذاب الیم

سے ڈرتا ہوں۔

غور فرمائیے کہ حضورؐ نبی اکرمؐ کو شمالی کے طور پر پیش کر کے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کی کس طرح جڑ کاٹ کر رکھ دی! یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ نظام خداوندی میں جسے الدین کہا جاتا ہے، حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔

لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں متعین احکام محدود سے ہیں اور زندگی کے باقی معاملات کے متعلق صرف اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جنہیں حدود اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور جماعت مومنین کا فرض ہے ان حدود کا تحفظ قرار دیا گیا ہے۔

وَالْحِفْظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ . (۳۷)۔ ان اصول و اقدار کو حدود کہنے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام اقوام عالم کے لئے ضابطہ حیات

حُدُودِ اللَّهِ

اور آئین زندگی قرار پاتا تھا اسے ہونا ہی ایسا چاہیے تھا کہ اس میں ابھی مستقل، غیر متبدل حدود متعین کر دیئے جلتے۔ اور اس کتاب کی حاکمیت قائم کرنے والوں کو اس کی آزادی ہوتی کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین اور وقتی

احکام خود متعین کریں۔ یہ جزئی قوانین حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے اور خدا کی مقرر کردہ حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل رہیں گی۔ اگر اس کتاب میں جزئی قوانین بھی خود ہی متعین کر دیئے جاتے تو یہ کتاب عالمگیر انسانیت اور زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتی۔ جزئی قوانین ابدی اور غیر متغیر ہو نہیں سکتے۔

حدود اللہ کے علاوہ قرآن مجید میں جو چند احکام آئے ہیں وہ بھی ابدی ہیں، لیکن ان کے متعلق قرآن کریم نے حکمت ملحوظ رکھی ہے کہ جن حالات میں انہیں نافذ کیا جائے گا اور جس طریق سے ان پر عمل پیرا ہو جائے گا انہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا۔ ان حالات کی روشنی میں طریق کار کا تعین ہر دور کی قرآنی مملکت خود کرے گی۔

(۸) یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جزئی قوانین کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے فرمادیا کہ یہ کچھ جماعت مومنین کے باہمی مشورہ سے کیا جائے گا۔ آپ غور فرمائیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے نظام مشاورت کا تصور ہی نہیں، اس کے قیام کا حکم دینا کیسی عظیم حکمت بالغہ ہے۔

نظام مشاورت

معمولاً آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی نظام جمہوریت کے دلدادہ اس نظام کی تائید میں قرآن کے نظام مشاورت کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ قرآن کے نظام مشاورت اور مغرب کے جمہوری نظام میں کھراور اسلام کا فرق ہے۔ قرآن کے نظام معاشرت میں یہ مشاورت قرآن کی قائم کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کارفرما ہو سکتی ہے۔ لیکن مغربی نظام جمہوریت میں قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی حدود اور قیود عائد نہیں ہوتے۔ اس میں اکثریت کا فیصلہ حق قرار پایا جاتا ہے۔ یہاں ایک بڑا بعیرت افروز نکتہ سامنے آتا ہے۔ سودہ انعام کی دو آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی آیت (۱) جس میں یہ کہا گیا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور اس نے اپنی حاکمیت کے لئے مفصل کتاب نازل کر دی ہے۔ اس کے ساتھ آیت (۲) میں کہا گیا کہ یہ کتاب مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ ان ازل بعد خدائے سمیع و علیم نے فرمایا:

ذَٰلِكُمْ أَكْثَرُ مِمَّنْ فِي الْأَمْثَلِ يُخْلِفُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ
وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔ (۱)

اگر تو اکثریت کا اتباع کرنے لگ جائے تو وہ بھٹے خدا کے راستے سے گمراہ کر دیگی۔ جو لوگ (وحی کی قیود کو اپنے اوپر عائد نہیں کرتے) وہ حق و صداقت کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ خدائے سمیع و علیم نے کس طرح چودہ سو سال پہلے موجودہ دور کے نظام جمہوریت کو باطل اور گمراہ کن قرار دے دیا۔ بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کو اس قسم اختیارات کا حامل تسلیم کر لینا انہیں مقام الوہیت عطا کر دیتا ہے جو شرک عظیم ہے۔ قرآن حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مشاورت کی اجازت دیتا ہے۔

(۹) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ پہلی قرآنی مملکت رسول اللہ نے قائم فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۱)

مملکت کے معاملات میں اپنے رفعت سے مشورہ کیا کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا وہ احکام خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اول تو وہی مجلس مشاورت

جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور و فکر کے بعد، یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلس مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس طرح حدودِ اشد تو اپنے مقام پر محکم اٹل اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا وہ قابلِ تغیر و تبدیل ہوگا۔ یہ نظام نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوں کے زمانے میں قائم رہا اور مشاورت سے طے پائے ہوئے امور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قرآن کے اسی نظام کا نام استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت ہے۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ امتِ مسلمہ میں یہ نظام اسی طرح مسلسل قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسول کی وفات کے بعد کچھ سے اس نظام کہیں کی طرف نہ پٹ جانا جس میں خدا کے مباحاتے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی تھی۔ (پہلا)

اگلے بڑھنے سے پیشتر اس نظام یا مملکت کے بنیادی عناصر ترکیبی ایک بار پھر سامنے لائے آئیے۔ یعنی :-

اسلامی مملکت کے عناصر

(۱) ان لوگوں پر مشتمل ایک امت جن کا ایمان یہ تھا کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی یہ حکومت اس کی کتاب کی روش سے قائم ہوتی ہے۔

(۲) اس کتاب میں نازل کردہ احکام و اصول و اقدار جنہیں حدودِ اشد کہا جاتا ہے، ابدی اور غیر متبدل ہیں اور ان کی روشنی میں جزئی احکام و قوانین امت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۳) جو کچھ اس طرح سے طے پائے گا وہ اس حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ ان احکام کو احکامِ شریعت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس حکومت کے سوا کسی کو نہ کسی قسم کے احکام وضع کرنے کا حق حاصل ہوگا نہ نافذ کرنے کا اختیار۔ (۴) یہ احکام تمام افرادِ امت پر یکساں نافذ ہوں گے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوں گے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی روش سے اس امت میں نہ الگ الگ فرقتے ہوں گے نہ ان فرقوں کے ایک دوسرے سے الگ قوانین۔ نہ ان میں مختلف مقننین کا وجود ہوگا نہ ان کی مرتب کردہ الگ الگ فقہیں۔ ایک امت، ایک ضابطہ ہدایت، ایک مملکت اور اس کی طرف سے نافذ کردہ ایک ضابطہ قوانین۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے صدِ اول کی کوئی مستند اور مصدقہ، بلکہ قابلِ اعتماد تاریخ ہمارے پاس نہیں۔ اُس دور کی سب سے پہلی جامع تاریخ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی جسے طبرستان کے ایک مؤرخ (امام طبری) نے کسی تحریری مواد کے بغیر زبانی روایات سے جمع اور مدقن کیا۔ بنا بریں تاریخی طور پر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ نظام مملکت کتنے عرصے تک قائم رہا لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقاء کرامؓ (جنہیں صحابہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے دورِ حکومت تک یہ نظام قائم تھا کیونکہ اس امر کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وہ مومن خدے تھے اور مومن خدے انہی کو کہا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کریں۔ اس کے بعد ہوا میرے زمانے میں بھی دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے بعد میں امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اہل تشیع کی حیثیت ایک سیاسی گروہ کی سمجھ لیجئے کیونکہ اُس زمانے میں ان کی کوئی الگ فرقہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور وہ سری بات یہ کہ اُس زمانے میں قرآن مجید کے سوا قانون (فقہ) کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اُس زمانے تک امت، امت واحدہ تھی۔ نہ اس میں مذہبی فرقے وجود میں آئے تھے نہ ان کی الگ الگ مرتب ہوئی تھیں۔ یہ کچھ ان کے بعد عباسیوں کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ (واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے نبی امیہ کے زمانے

کے متعلق لکھا ہے وہ ہمارا تاریخی اندازہ ہے جس کی صحت پر ہم اصرار نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اسے ہمارے پیش نظر موضوع سے خاص تعلق ہے ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی نظام مملکت کچھ عرصے تک قائم رہا اور اس کے بعد اس میں تبدیلی آگئی۔

(۱)

۱۱۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ دین کا ممکن قرآنی نظام مملکت کے ساتھ مشروط اور وابستہ ہے۔ یہ نظام نہ رہے تو معاشرہ میں دین کا وجود ہی نہیں رہتا۔ جب قرآنی نظام حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی (اور ملوکیت بھی اپنی بدترین شکل۔ یعنی موروثی بادشاہت کے پیکر میں) تو دین باقی نہ رہا۔ اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس کے بعد تاریخ کے اس دور سے دو دور میں (یعنی اس زمانے سے لے کر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوئی۔ ملوکیت نے سب سے پہلے تنوعیت کی طرح ڈالی یعنی امور مملکت (جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں پبلک لائف کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین ارباب مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔ مسلمان بادشاہ، امور مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیا کرتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے۔ اسی تاثر کو ہمارے علماء کرام کی تائید اور بھی تعزیت پہنچاتی تھی۔ وہ ان موروثی بادشاہوں کے حق میں مہراب و منبر سے اٹھ کر اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکۃ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ انہیں ظلال اللہ علی الارض، زمین پر خدا کا سایہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ملوکیت کے اس ماحول میں امور مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہو کر آتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتویٰ سے لگا لیجئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب رہا تیبہ اولین جمیعہ کی (صفحہ ۱۸۶) میں ان الفاظ میں درج ہے۔

کل شیء صنعه الامام الذی لیس فوقہ امام فلاحد علیہ الا قصاص۔
یعنی جن جرائم کی مزاحمت ہے سربراہ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ بجز قصاص کے۔ یعنی سربراہ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر حد نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی، اس لئے مختلف فقہانے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے۔ اور ان کے معتقدین تھے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت و اعداء فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہاء کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یعنی ۱۔

(۱) امام اعظم (کوفی)	پیدائش ۱۵۰ھ	وفات ۲۴۱ھ
(۲) امام مالک (مکئی، مدنی)	پیدائش ۱۷۹ھ	وفات ۲۶۱ھ
(۳) امام شافعی (عسقلانی، مکئی)	پیدائش ۲۰۴ھ	وفات ۲۷۰ھ
(۴) امام احمد بن حنبل (بغدادی)	پیدائش ۲۴۱ھ	وفات ۳۲۴ھ

(اہل تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے)

شروع شروع میں تو ان ائمہ فقہاء کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی قبرست میں حکم و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے مخالف ہو جس کا

فوتی اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ کے پیشوا اور مستم امام ابو الحسن عبید اللہ الکفعمیؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ:۔
ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالفت ہو جس پر مجاہدے اصحاب ہیں وہ یا تو متزل ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح
جو حدیث اس قسم کی ہو وہ متزل یا منسوخ ہے۔

اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے بعد اُس وقت تک کے دیتے گئے فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان مجموعوں
کا نام فقہ حنفی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ امام ابو حنیفہؒ کی مرتب کردہ نہیں۔ یہ حنفی مسلک کے مختلف فقہاء کے فتاویٰ
کا مجموعہ ہے۔ انہی فتاویٰ کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیریؒ کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام
سے مشہور ہے۔

فہمیب کی حیثیت سے (یعنی دینی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے) ان فقہی احکام کی ایک اہمیت
ضروری تھی اور وہ یہ کہ کم از کم ایک فقہ کے مقلد ایک مسلک سے منسلک رہتے تھے۔ لیکن اسے دینی حیثیت تو کسی صورت
میں بھی نہیں دی جاسکتی۔ دین کا ممکن تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جب قرآنی نظام مملکت باقی نہ رہا تھا۔
دینی نقطہ نگاہ سے اس میں ایک اور بنیادی خرابی تھی اور وہ یہ کہ انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کو درجہ الوہیت
دے دیا گیا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قوانین خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل
ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جائے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دے دینے کے مرادف ہوگا۔
قرآن کریم نے سابقہ اہل کتاب کے خلاف جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اَتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُحَبَاءَهُمْ اَرْبَابًا
رَبَّنَّ ذُنُوبُنَا عَلَیْكَ۔ (۲۱) کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دے دیتے تھے تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ
الہ کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دے دیتے تھے اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآن کریم نے امت میں
فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (۲۲)۔ فرقے کا وجود اس عقیدہ پر قائم ہوتا ہے کہ اسکے
متبعین اپنے فوٹے کے بانٹوں کے وضع کردہ عقائد و احکام کو منفرد، ابدی اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ کوئی دس سال آدمی کی
بات ہے کہ چارے ہاں یہ خیال ابھر کر مروجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقاتی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے
ہوئے جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد نقانوی نے ارشاد فرمایا کہ:۔

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک
پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہذا اگر تحقیقات
اسلامی سے ایسے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور متعین شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے
مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امت محمدیہ کا

لے تادیب و التشریع الاسلامی۔ مؤلف علامہ محمد العزیز کا اردو ترجمہ۔ "تاریخ فقہ اسلامی"

شائع کردہ: دار المصنفین، اعظم گڑھ۔ مسئلہ

لے ائمہ کا تحقیقی قابلیت مسلم۔ ان کا فتویٰ اور دیانت بھی شک و شبہ سے بالا۔ لیکن اس کے باوجود وہ تھے انسان ہی۔ انہیں مقام
الانیت سے بلند تصور کر کے الوہیت کے درجہ پر سرفراز کر دینا، وہ غلو فی الدین ہے جس سے قرآن کریم نے سختی سے منع کیا ہے۔

اجماع ہے۔ (بحوالہ ایشیا۔ سہ اگست ۱۹۶۸ء)
یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آ رہا ہے۔

(۱۰) یہ صورت صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی کہ فطرت کی کرم گسری سے ہمارے ہاں ایک ایسا دیدہ وریدا ہوا جو اقبال کے نام سے معروف ہے۔ اس کی نگہ بصیرت نے جب ”عالم اسلام“ (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیا تو اس نے دیکھا ان میں کسی جگہ بھی نہ اسلامی حکومت قائم ہے نہ اسلام اپنی صحیح شکل میں کارفرما یہاں **اقبال کی نگہ بصیرت** خلافت کی جگہ ملکیت نے لے رکھی ہے اور دین کی جگہ مذہب نے۔ اس نے اس کے خلاف جہاد کا عزم کیا اور ساری عمر اس پر قائم رہا۔ اس نے دیکھا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ خلافت کی جگہ ملکیت نے لے رکھی ہے۔ خلافت سے مراد ہے قرآنی نظام حکومت جو صدر اول میں قائم ہوا تھا۔ اچنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے خلاف نعرہ بلند کیا اور کہا کہ وہ

خلافت بر مقام ناگواہی است حرام است آنچہ بر پاودشاهی است
ملوکیت ہر مکر است و نیز جنگ خلافت حفظ ناموس الہی است

(اردغان مجاز۔ ص ۱۲)

انکے صفحے پر لکھتے ہیں:-

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش ناقام است
غلام فقراں گیتی پس ہم کہ در پیش ملکیت حرام است
یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا اور عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ۔ اسے اس کا پورا پورا احساس تھا کہ اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی بنا پر اس نے کہا تھا کہ:-

دراخت با ملکیت کلیے فقیرے بے کلا ہے ابے تخلیے
گنجے با شد کہ باز بہائے تقدیر بگنجد کار صر از سنیے

۱۲۷

اسے معلوم تھا کہ اس انقلابی نعرہ کی مخالفت میں مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے میدان کارزار میں سامنے آئے گی۔ اقبال کے کلام میں ملاح کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی خاص شخصیت یا گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مسلک اور وجود کے خلاف ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کر رہا تھا۔ ملکیت اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت، اس جنگ کا منہی پہلو تھا۔ اس کے مثبت پہلو کے سلسلہ میں اقبال یہ جانتا تھا کہ اسلامی نظام کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اسے عملی شکل میں سامنے نہ لایا جائے۔ اور ایسا کیا جانا ایک ایسی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکت پاکستان کا تصور دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مملکت میں پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اس میں اسلامی قوانین کس اصول کے مطابق مدون کئے جائیں۔ اس سوال کے ضمن میں انہوں نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور علاوہ دیگر مقالات، انہوں نے اپنے مشہور خطبات میں ایک پر خطبہ اسی موضوع کے لئے وقت کر دیا۔ ہم اس خطبہ کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش قارئین کرتے ہیں۔

خطبہ اقبال کے اقتباسات

”اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی خود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر جیسے متغنا و عتنا صہ میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔۔۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔۔۔ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوتی ہے، یکسر جامد و متصاب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کا فرما رہا ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں“

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مستند اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہاد و مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا مکمل اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔۔

”مستی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق محرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا، آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانون شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا“

ہم اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں علامہ اقبال نے اس مجرور و متغزل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اسی خطبہ میں لکھتے ہیں۔۔۔

”آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی روش سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی ماہمائی سے ہمارے قدیم فقہائے قانون شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حقیقت سے اسلام کو جو اصل

کامیابی حاصل ہوتی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کارہن منت سما تھا چنانچہ خان کبیر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سو دسے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتیٰ اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علماء اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور ختم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے دیکھے صفحات ہیں، ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیا کے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں ٹھکانا انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، ختم اور سہو و غلط سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں! اس لئے اگر دور حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرز عمل میرے خیال میں بالکل سبک اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرتے ہیں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔“

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کہ تاریخ کا مجموعہ احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:۔
”قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے مجموعے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دور حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:۔“

”تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔“

پھر ہمیں صندی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جمہوری نقد پس سے جماعتی نغمہ کو جامد اور مستحکم طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے کیر خلافت تھا؟
اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

”اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افرتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قلمروں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) مہبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علماء کے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس ”افترارہ کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دور حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ مہبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔“

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و متفہمین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے رستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسائل موجود ہیں (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ارباب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت امام اعظمؒ نے کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :-

» امام شافعیؒ نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالت مآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتب فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ اور تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ «

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

» لیکن جاتے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے فقہاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقامات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔ «

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، علامہ اقبالؒ کو اس کا احساس تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے اس نظریے کی

شدت سے مخالفت ہوگی چنانچہ انہوں نے لکھا :-

» مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون کے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دور حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیالی کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابل ترقی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی فقط نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھا پا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول

دے گا۔ بایں ہمہ میں اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔

اس سے بھی بہت پہلے انہوں نے (صوفی فلام مصطفیٰ تبسم مرحوم) کے نام) اپنے ایک خط میں لکھا تھا: ”مزدت اس امر کے ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے ”جورس پرڈوس“ یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سولے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر جنس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہار اللہ کو پیدا کیا جو مرے سے احکام قرآنی کا ہی منک ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا فطر نامکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔“

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ”جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔“ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ امام اعظمؒ اپنے فتاویٰ کو کبھی ابدی اور غیر متبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔

نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا: ”اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟“ شامی نے جواب دیا: ”ہاں!“ اس پر امامؒ نے فرمایا: ”خیال رکھنا۔ تم بڑے ستر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو، خطیب ج ۱۲ ص ۱۳)۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: ”بھلا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا چایا کرتے تھے جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا: ”یعقوب! میرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے مسئلہ ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کہ کج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا

مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابو حنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا خذ مشرعبا دی الذین يستمعون القول فيستبعون أحسنه۔ یعنی لے پیغمبر امیر سے ان بندوں کو بشارت دید و جو باتوں کہ سنتے ہیں اور کچھ ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ (ایضاً ج ۱۳۔ ص ۲۵۲) حسن بن زیاد نووی کہتے ہیں کہ ہمارا یہ قول (فقد) ایک نئے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکتے ہیں جو ہمارے قول سے بہتر رائے لاسکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔ (ایضاً)

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابل تغیر و تبدل قرار پائیں سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے کہ بر محمد بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پانا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ (اور ابو اسحق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابو حنیفہؒ کے سامنے اکثر نیکی کی حدیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔ (بغدادی۔ جلد ۱۱۔ ص ۲۸۵)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے :

ابو حنوفہؒ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلیٰ آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چہرہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی جھجکاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ماتھ کاٹ دو۔ ایلیٰ چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پہل چلوا ری کی چوری میں اتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ غنما اس آدمی کی ہڈ کو پیچھے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ماتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی جھجکاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۹)

امام اعظمؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس میں شک ہے کہ وہ ارشاد رسول اللہ کا ہے یا نہیں۔ آپ نے کہا کہ اگر وہ رسول اللہ کا ارشاد تھا تو مجھے وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۱۱)

اصول قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ابدی اور غیر متبدل قرآن مجید کے احکام، اصول اور اقدار ہیں جنہیں وہ محدود اللہ کہہ کر بجاتا ہے۔ ہر اسلامی مملکت اس کی مجاز ہوتی ہے کہ وہ ان احکام کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئی قوانین اور طریق کار خود متعین کرے۔ ایسا کرنے میں وہ سابقہ اقدار کے قوانین سے بطور نظر انداز استفادہ کر سکتی ہے لیکن وہ ان کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتی۔ اس باب میں وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور نمونہ

استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و عیادت کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی روش سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصد بالذات نہیں ہوتی، انہیں آتے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

(خطبات - تشکیل جدید - چھٹا خطبہ)

اگر تشکیل پاکستان کے بعد علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اسی اصول کے مطابق قوانین مرتب فرماتے اور اس طرح صوبوں کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں کی ایک مملکت کو صوبوں میں اسلامی بنادیتے۔ لیکن ہماری بد قسمتی کہ وہ اس سے بہت پہلے دنیا سے تشریف لے گئے اور اسلامی قوانین کے جس نظریہ اور مسلک کے خلاف انہوں نے اس قدر جہاد کیا تھا وہ یہاں غالب آگیا۔ اور اس خطہ زمین کو اسلامی مملکت بنانے کا جو حین خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ خواب پریشاں بن کر رہ گیا۔ قوانین حدود کی جو پہلی قسط حال ہی میں نافذ ہوئی ہے وہ اس کی بدیہی شہادت ہے۔

کسی ایک دور کے حالات کے مطابق مرتب کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے دینے میں بنیادی نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ قوانین آنے والے زمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لئے ان پر عمل کرنا یا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ حالیہ قوانین میں سے تین (ذنا، سرقا اور قذف) کی سزائیں تو قرآن کریم کی مقرر کردہ ہیں لیکن ان جرائم کے ثبوت وغیرہ کی شرائط اور طریق کار فقہ کے تحت سے معین کیا گیا ہے۔ اس طریق کار کی روش سے ان قوانین پر عمل درآمد میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں یا آئیں گی وہ قابل غور ہیں۔ مثلاً :-

(۱) ان جرائم کے اثبات کا مدار شہادات پر رکھا گیا ہے اور گواہوں کے متعلق شرط یہ ہے کہ وہ التزم الحکم ہے (TIRUTHFUL) ہوں اور گناہ کبیرہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں (اسے فقہی اصطلاح میں تزکیۃ الشہود کہا جاتا ہے) فقہ کی روش سے گناہ کبیرہ کی فہرست ایسی طویل طویل ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس کی زد میں نہ آجاتا ہو۔ یہی شرائط حج کے لئے بھی ہیں جس زمانہ میں یہ شرائط مقرر کی گئی تھیں، اس میں حالات کیا تھے اس کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن گرج ہمارے معاشرے میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ملے جو ان شرائط پر پورا اترے۔ ظاہر ہے کہ اول تو تمام کے تمام دور نہ تھا تو اسے فیصد مقدمات اسی بنا پر خارج ہو جایا کریں گے کہ گواہان (اور اکثر و بیشتر حج مصالحان) تزکیۃ الشہود کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ علاوہ ازیں جس زمانے میں ہماری فقہ مرتب ہوئی تھی، تفتیش جرائم کا ذریعہ صرف گواہوں کی شہادات ہو سکتی تھیں۔ لیکن اب اس مقصد کے لئے انواع و اقسام کے سائنٹیفک طریق تفتیش ایکب دہو چکے ہیں۔ باعہد پاؤں کے نشانات، خون کا تجزیہ، ڈاکٹری معائنہ، کمپوٹرز کی ٹیو وغیرہ۔ ان ذرائع کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں انسانی جذبات کی آلائش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے عدل گستری کے طریق کار کو خود ہی اس لئے مستعین نہیں کیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ جوں جوں علم انسانی وسعت اختیار کرے گا، قسم قسم کے ذرائع تحقیق و تفتیش وجود میں آتے جائیں گے۔ اپنے آپ کو ان ذرائع کے فوائد سے محروم کر لینا منشا سے خداوندی کے خلاف ہے۔

نیز، ملزم اگر مسلمان ہے تو گواہ بھی مسلمان ہونے چاہئیں۔ غیر مسلم ہے تو غیر مسلم۔

(۶۱) جرم زنا کے ثبوت کے لئے ایسے چار گواہوں کی شرط رکھی گئی ہے جنہوں نے عمل دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ آج کا دور تو ایک طرف، ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کوئی ایسا کیس دکھائی نہیں دیتا جس میں اس قسم کی شہادت پیش ہوئی ہو۔ علاوہ اس کے کہ اس قسم کی شہادت کا میسر آنا ناممکن ہے، اس میں ایک اور خطرہ بھی لاحق ہے۔ فقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی مقدمہ میں (مثلاً) تین عینی گواہ ہوں اور چوتھا گواہ یہ کہہ دے کہ میں نے دخول کو تو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا البتہ اس مرد اور عورت کو ایک ہی لحاف میں پیٹھے ہوئے دیکھا ہے تو یہ شہادت قابل اعتبار تصور نہیں ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملزم کو بری ہو جائے گا لیکن اول الذکر تین گواہوں پر قذف کی سزا دارو کر دی جائے گی کیونکہ انہوں نے ایک بے گناہ کے خلاف زنا کی تہمت لگائی ہے۔

زنا بالجبر میں یہ صورت اور بھی نزاکت اختیار کر جائے گی۔ مظلوم عورت ایک متعین مرد کے خلاف فریاد کرے گی اور جب وہ اس کے ثبوت میں چار عینی گواہ پیش نہیں کر سکے گی تو وہ مرد تب بے گناہ قرار پا جائے گا اور اس عورت پر قذف قذف صادر ہو جائے گی۔

(۶۲) سرقت کے جرم کے اثبات کے لئے اسی قسم کے دو گواہوں کی شرط لازم قرار دی گئی ہے۔ ان میں مدعی شامل نہیں ہوگا۔ اگر دو کی جگہ گواہ ایک ہی ہو تو جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ دو گواہوں کے علاوہ کسی قسم کے تقاضائی ثبوت کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

(۶۳) ان تصریحات سے واضح ہے کہ فقہی طریق کار کی رُو سے شاید ہی کوئی جرم پایہ ثبوت تک پہنچ سکے۔ اس مشکل کے حل کے لئے ان قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر اس طریق سے جرم ثابت نہ ہو سکے تو مروجہ قوانین کی مطابق مقدمہ کا فیصلہ کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر کہا گیا ہے کہ جب اسلامی قوانین مؤثر ثابت نہ ہوں کیونکہ وہ ناممکن العمل ہیں تو پھر اپنی غیر اسلامی قوانین کی طرف رجوع کیا جائے جو اس وقت ملک میں نافذ ہیں اور جنہیں اسلامی قوانین سے بدلنے کے لئے اس قدر تک و دو کی جا رہی ہے۔ سوچئے کہ اس سے دنیا اسلام کے متعلق کیا تصور قائم کرے گی کیا اس کا یہ تاثر اور اعتراض مؤثر نہ ہو جائے گا کہ اب اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اس لئے ہے کہ ہم نے ہزار سال پہلے کے فقہاء کے وضع کردہ قوانین کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔

(۶۴) ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ ان قوانین کی رُو سے جرائم پایہ ثبوت تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے تو یہ ہمارا ہی خیال نہیں، خود محترم صدر عدلیہ کی بھی اس کا احساس ہے جس کا اظہار انہوں نے پچھلے دنوں امریکی ٹی۔ وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ ٹی۔ وی ٹیم نے اعتراض کیا تھا کہ اس قسم کے قوانین کس طرح عدلیہ انسانی کے مطابق کہلا سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں صدر محترم نے فرمایا تھا:

سوال: مغرب میں بعض لوگ مسلمانوں کو وحشی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ان کے لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دینا کس طرح عدلیہ انسانی کہلا سکے گا؟

جواب: یہ ٹھیک ہے۔ میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام تعذیب (PUNISHMENT) کے مقابلہ میں تنوید یا تہدید (DETERRENCY) پر زیادہ زور دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس فلسفہ

پر نگاہ رکھیں جو ان (نام نہاد) سنگین سزائوں (مثلاً باعہ کاٹ دینا یا ہاتھ اور پاؤں دونوں کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا) کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانون شہادت کی زد سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے ایک فی ہزار بھرموں کو بھی یہ سزائیں دی جا سکیں گی۔ اسلام صرف سزائیں مقرر نہیں کرتا، وہ پہلے یہ بھی متعین کرتا ہے کہ جو شخص ایسے مقدمات کے فیصلے کرے گا وہ کس قسم کا ہے۔ ان جھوٹے یا قاضیوں کے لئے جو اس قسم کے مقدمات کی سماعت کریں گے، بڑی کڑی شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیے جس کی سیرت اور کردار کے خلاف انگشت نمائی نہ کی جاسکے۔ اسے انتہائی دیا مند ہونا چاہیے۔ اسے اچھا مسلمان ہونا چاہیے، اسے کسی کے خلاف تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ (یعنی اسے انتہائی غیر جانبدار ہونا چاہیے)۔ یہ تو رہیں اس نوع کی خصوصیات جو ایسے مقدمات کی سماعت کرے گا۔ جہاں تک ان شہادات کا تعلق ہے جو اثبات جرم کے لئے پیش کی جائیں، تو ان کے بارے میں بھی ایسی کڑی شرائط عائد کی گئی ہیں جن کی زد سے کسی ایسے شخص کا مجرم قرار یا جاننا ناممکن ہو گا جس کے ارتکاب جرم کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہو۔ مثلاً گواہ کو عینی شہاد ہونا چاہیے۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیے جس نے ہمیشہ سچ بولا ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ جس کا کیریکٹر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہو۔ نیز اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ملزم سے یہ جرم پہلی بار صادر ہوا ہے تو متعلقہ عدالت سزا کے تعین میں اس کا خاص خیال رکھے گی۔ اکثر احادیث نبویؐ میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب اس قسم کے جرائم کا مقدمہ سامنے آئے جو قطعید وغیرہ سزائوں کے مستوجب ہوں تو کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی ایسا عذر مل جائے جس کی روشنی میں نرم سزا دی جاسکے خواہ اس میں کچھ سا شک بھی کیوں نہ ہو۔ (یعنی ذرا سے شک کا فائدہ بھی ملزم کو ملنا چاہیے)

سوال: اس کا مطلب تو یہی ہوتا کہ ان سزائوں کا بنیادی مقصد تخویف ہے۔

جواب: یہ ٹھیک ہے۔ بنیادی مقصد تخویف ہی ہے۔ ان سزائوں کے سلسلہ میں یہ وہ اہم پہلو ہے جس کے نظر انداز کرنے سے اہل مغرب کو غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ اسے بھول جاتے ہیں کہ قانون شہادت، جھوٹ کی تعیناتی، گواہوں کے متعلق شرائط۔ (یعنی وہ پورے کا پورا ضابطہ جس کی زد سے کسی ملزم کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، ایسا سخت ہے کہ ایک ہزار میں سے بشکل ایک مقدمہ ایسا ہو گا جس میں یہ انتہائی سزائیں دی جا سکیں گی۔

یعنی یہ نہیں کہ ان قوانین میں مقرر کردہ سخت سزائوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک میں جرائم کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ یہ کہ یہ سزائیں دی ہی نہیں جا سکیں گی۔ اس لئے انہیں سنگین یا وحشیانہ قرار نہیں دیا جاسکتا!

یہ تو رہیں ان فقہی قوانین کے داخلی استقام کی مثالیں۔ جہاں تک ان کے عمومی اطلاق کا تعلق ہے، صورتِ حالات

اس سے بھی کہیں نازک اور شدید ہے۔ آپ کسی فرقہ کی فقہ کے قوانین بھی ناظر کریں، دوسرے فرقے انہیں کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ ان کے خلاف احتجاج کو

اپنا مذہبی تقاضا قرار دیں گے۔ مذہبی تقاضا کس قدر شدید ہوتا ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگا لیجئے۔ تشکیلِ پاکستان کے روزِ اول سے اس وقت تک ملک میں غیر اسلامی قوانین رائج چلے آ رہے ہیں۔ کسی فرقہ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ہم ان

فرقہ وارانہ اعتراضات

قوانین کی اطاعت نہیں کریں گے۔ لیکن جو یہی یہاں ایک فرقہ کے فقہی قوانین نافذ کئے گئے تو دوسرے فرقہ کی طرف سے
 ہمدانے احتجاج بلند ہو گئی کہ ہمارے لئے یہ قوانین قابل قبول نہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فرقہ دارانہ یہی
 تقاضوں کی شدت کیسی ہوتی ہے۔

(۷)

ہمیں کہہ چکے ہیں کہ یہاں پاکستان کے بعد اگر علامہ اقبالؒ انہم میں موجود ہوتے تو یہاں شرعی قوانین ان کے پیش کردہ اصول کے مطابق
 آسانی سے مرتب ہو جاتے۔ اس اصول کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم تشکیلات کو نظر کا شکار ہو رہی ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ یہاں
 تائید سنت کے مطابق قوانین وضع ہونگے۔ بیس برس کے بعد موقدعی صاحب نے فرمایا کہ کتاب و سنت کی روش سے سبک لڑا کا کوئی ایسا
 ضابطہ مرتب نہیں کیا جاسکتا جو تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ پھر حنفی فرقوں
 نے اس کے خلاف شور مچایا تو بات دب گئی۔ اب جو قوانین نافذ ہوئے ہیں تو وہ فقہ حنفی پر متفرع ہیں۔ مذہب یہ کہ ان کی مخالفت
 ہو رہی ہے بلکہ وہ ناممکن العمل بھی ہیں۔ فقہ کے متعلق خود موقدعی صاحب کے جو خیالات ہیں ان کی روشنی میں سمجھ میں نہیں
 آتا کہ انہوں نے کیسے تجویز کر دیا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ ان کا ارشاد ہے:-

- (۱) اس نسخہ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک ستمند شاہ تر بنا کر رکھ دیا گیا ہے (ترجمان القرآن بابت مہرم ۱۳۷۰ء)
 (۲) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان و مکان کے تغیرات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام امور و احوال پر وسیع ہو سکتی
 ہے۔ لہذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تنبیہات حصہ دوم - ص ۲۶۷)
 (۳) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اقتساب کرے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا
 کے لئے دائمی قانون اور اہل عامہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی عقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قید سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات - ص ۱۲)

اس کے برعکس

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے، اور جس کے علم میں

زمانہ کے تغیرات سے ذرا برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات - ص ۱۲)

اور یہ علم خداوندی اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہے۔ لہذا، وہی قوانین اسلامی بھی کہاں سکیں گے اور ممکن العمل بھی ہونگے جو خدا کی کتاب کی
 روشنی میں، اس اصول کے مطابق مرتب کئے جائیں جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں مل رہی ہے۔ اگر مختلف فرقے اس اصول کو تسلیم
 نہیں کرتے تو نہ متفق علیہ اسلامی قوانین مرتب ہو سکتے ہیں، نہ اسلامی مملکت وجود میں آ سکتی ہے۔

قرآنی قوانین اللہ الحمد کہ پرفیض صاحب کی تازہ ترین تصنیف قرآنی قوانین۔ ملک میں ہیہ مقبول
 ہو رہی ہے اور اس کی افادی اہمیت نگہ کر سامنے آرہی ہے اس سے نظر آتا ہے کہ

اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلد ہی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) میں روپے (علاوہ محصول ڈاک) مٹھنے کا پتہ

راج مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور